جموں وکشمیر جماعت اسلامی پر پابندی کیوں؟

افتخار گیلانی ○

۷۰ء کے عشرے میں میرے چچا ڈاکٹر مشتاق گیلانی نے ہمارے آبائی قصبہ سوپور میں ایک تختی اور بستہ میرے کاندھوں پر لاد کر، ہاتھ پکڑتے ہوئے مرکزی درس گاہ، محلہ مسلم پیر میں پہلی جماعت میں داخل کرا دیا۔ یہ درس گاہ، براہِ راست جماعت اسلامی کے شعبۂ تعلیم کے تحت تھی۔ مدت گزرنے کے باعث اکثر یادیں دھندلی ہوچکی ہیں، مگر جن مشفق اساتذہ نے ہاتھ تھام کر تعلیم کا آغاز کرایا، ان محسنوں کی یادیں ابھی تک ذہن میں نقش ہیں۔

لیکن پھر ہوا یہ کہ بس دو ہی سال بعد اندرا گاندھی اور شیخ عبداللہ کے درمیان ہونے والے فروری ۱۹۷۵ء میں معاہدے کے نتیجے میں شیخ عبداللہ صاحب وزارت اعلیٰ کے منصب پر فائز ہوئے۔ اپوزیشن کے دباؤ اور اعلیٰ عدالت کے ایک فیصلے سے پریشان وزیراعظم اندرا گاندھی نے جون ۱۹۷۵ءکو پورے ملک میں ایمرجنسی نافذ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اقتدار کی دیوی کی آغوش میں تازہ تازہ آئے شیخ صاحب نے بھی دیکھا دیکھی کشمیر میں ایمرجنسی نافذ کی اور جماعت اسلامی اور اس سے ہمدردی رکھنے والے تعلیمی، معالجی اور رفاہی اداروں کو بھی مقفل کر دیا۔ اس ایک فیصلے سے جموں وکشمیر میں، ہم ۲۰ ہزار طلبہ و طالبات پر اسکولوں کے دروازے بند ہوگئے، اور انھیں پریشانیوں میں دھکے کھاتے ہوئے سرکاری اسکولوں میں پناہ لینا پڑی۔ جماعت اسلامی تو ان دنوں جموں وکشمیر کی انتخابی سیاست میں پیش پیش تھی اور اسمبلی میں اس کی نمایندگی بھی تھی۔ 'اندرا عبداللہ ایکارڈ' کی مخالف جماعت اسلامی نے گاندربل حلقے سے شیخ عبداللہ کے مقابل محمد اشرف صحرائی کو بطور اُمیدوار

○ نئی دہلی

میدان میں اتارا تھا۔ یہ ایک طرح سے ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ تھا، مگر نیشنل کانفرنس معمولی سا اختلاف رائے برداشت کرنے کی بھی متحمل نہیں تھی۔ صحرائی صاحب کے الیکشن ایجنٹ ڈوڈہ کے سعداللہ تانترے کو سید پورہ آلسٹینگ کے مقام پر کھیتوں میں نہ صرف زدوکوب کیا گیا، بلکہ ان کی ایک آنکھ بھی نکال دی گئی۔ طرفہ تماشہ دیکھیے کہ چند ہفتے پیش تر یہاں پر جماعت اسلامی پہ جو پابندی عائد کی گئی ہے، اس میں ایک 'جرم' یہ بھی ہے کہ یہ انتخابی سیاست میں یقین نہیں رکھتی ہے۔ اب اس سادگی پر مر نہ جائے کوئی!

۱۴فروری کو پلوامہ میں بھارتی فوجی دستوں کے قافلے پر ایک خودکش حملے کے جواب میں پاکستان پر ہوائی حملوں کے بعد کھسیانی بلی کھمبا نوچنے کے مصداق بھارتی وزیراعظم نریندر مودی نے اپنی انتخابی حکمت عملی کا رخ دوبارہ کشمیر کی طرف موڑ دیا ہے۔ حُریت کے لیڈروں کو نظر بند رکھنے اور فوجی آپریشن وغیرہ کی ناکامی کے بعد اب بتایا جارہا تھا کہ حریت کانفرنس پر پابندی عائد کر کے لیڈروں کو پابند سلاسل کیا جائے گا۔

سید علی گیلانی پچھلے نو سالوں سے مسلسل گھر پہ نظر بند ہیں۔ پچھلے دنوں سرینگر سے دہلی واپس آتے ہوئے ایرپورٹ روڈ پر جب ان کی رہایش گاہ پر پہنچا، تو دیکھا کہ گلی میں تین بکتر بند گاڑیاں ان کے گیٹ کو بلاک کیے ہوئے ہیں۔ سخت سردی میں دو درجن کے قریب سیکورٹی کے اہل کار باہر کھڑے، اندر جانے کے لیے نام وغیرہ کا اندراج کر رہے تھے۔ اندر جانے کی اجازت دینا ان کے موڈ پر منحصر ہے۔ گیلانی صاحب خاصے کمزور نظر آرہے تھے۔ اگرچہ اخبارات وغیرہ کا مطالعہ کر رہے تھے، مگر بتایا کہ کمزوری اور نقاہت کے باعث اب کچھ تحریر نہیں کر پاتا۔ پہلی بار ڈائری سے ساتھ چھوٹ گیا ہے۔ ان کے دفتر کے افراد اور رفقا زیرحراست ہیں۔ گھر کا ملازم چند ماہ قبل گاؤں گیا تھا، واپسی پر اس کو اندر جانے کی اجازت ہی نہیں ملی۔ مجھے بٹھا کر خود ہی اندر اطلاع کرنے چلے گئے۔

اسی سلسلے میں جماعت اسلامی جموں وکشمیر پر پانچ سال تک پابندی عائد کر کے اس کے امیر ڈاکٹر عبدالحمید فیاض، ترجمان ایڈووکیٹ زاہد علی سمیت ۴۰۰ کے قریب اراکین کو اب تک گرفتار کیا جا چکا ہے۔ اور یہ سطور لکھنے تک روزانہ کہیں نہ کہیں سے، جماعت کے کسی کارکن کی گرفتاری کی خبر موصول ہوتی ہے۔ جماعت کے دفاتر اور تعلیمی ادارے بھی سیل کر دیے گئے ہیں۔

کئی جگہوں سے اطلاعات ہیں کہ ارکان کے ذاتی رہایشی گھر بھی سیل کر دیے گئے ہیں۔ شدید سردی اور برف باری کے موسم اور رات کے اندھیرے میں گھر کی عورتوں، بچوں اور بزرگوں کو بے دخل کر کے گھر سیل کیے گئے ہیں۔ ان بے قصور افراد سے آشیانہ چھین کر مبتلاے عذاب کرنا انسانی حقوق کی بدترین خلاف ورزی ہے، جب کہ گھر کے مرد یا تو پہلے سے حراست میں ہیں، یا پھر روپوش۔

۱۹۷۷ء میں جب جماعت اسلامی پر پابندی اٹھائی گئی تو تعلیمی اداروں کے انتظام وانصرام کے لیے اس نے 'فلاح عام ٹرسٹ' قائم کیا۔ اس وقت اس ٹرسٹ کے تحت براہ راست ۳۵۰/اسکولوں میں ایک لاکھ سے زائد طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ پھر بالواسطہ طور پر تقریباً اتنے ہی اسکول 'فلاح عام ٹرسٹ' کی تعلیمی کاوشوں کے ساتھ منسلک ہیں۔ پابندی کے فوراً بعد جب دنیا کے دور دراز خطوں سے، ان اداروں سے فارغ التحصل طلبہ، یعنی ایلومنائی کے پیغامات آنا شروع ہوئے، تو پہلی بار معلوم ہوا کہ ان اداروں سے اٹھا ہوا ابر تو سارے جہاں پر برس رہا ہے۔ تقریباً ۳۰۰/ایلومنائی نے ایک مشترکہ یادداشت میں حکومت کو بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ ادارے غریب اور دُور دراز کے دیہات میں تعلیمی معیار کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اس لسٹ میں ایسے محقق اور پروفیسر شامل ہیں، جو فی الوقت نام ور اداروں، یعنی ہارورڈ یونی ورسٹی، امپیریل کالج، سوئزرلینڈ، ویسٹ منسٹر، امریکا کے طبی تحقیق کے اعلیٰ اداروں، بھارت کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، علی گڑھ و جامعہ ملیہ اسلامیہ وغیرہ میں کام کر رہے ہیں۔

ان ماہرین، اسکالرز اور سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ان کی کامیابی میں ان اسکولوں اور وہاں کے اساتذہ کی محنت، لگن اور خلوص بھی شامل ہے۔ اس یادداشت پر دستخط کرنے والوں میں ایک کشمیری پنڈت خاتون نتاشا کول بھی ہیں، جو اس وقت یونی ورسٹی آف ویسٹ منسٹر، لندن [تاسیس: ۱۸۳۸ء] میں پڑھاتی ہیں۔ ایک طرف حکومت تو خود معیاری تعلیم دینے سے عاری ہے، دوسری طرف جو ادارے اس طرف عوامی خدمت، محنت اور لگن سے دن رات مگن ہیں، ان کا گلہ گھونٹنے سے نہیں کتراتی ہے۔ جموں وکشمیر میں اعلیٰ عہدوں پر براجمان، خود گورنر کے دفتر میں افسران کی ایک بڑی تعداد انھی اسکولوں سے فارغ التحصیل ہے۔ اس یادداشت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ۱۹۹۰ء میں بھی اس وقت کے گورنر جگ موہن نے ان اداروں پر پابندی عائد کی تھی،

مگر بعد میں سپریم کورٹ نے اس غیر منصفانہ پابندی کو ختم کر دیا تھا۔ ان ایلومنائی کا کہنا ہے کہ: ''آخر سیاسی صورت حال سے نمٹنے میں ناکامی کا نزلہ ان تعلیمی اداروں پر کیوں اتارا جاتا ہے؟'' ۱۹۹۷ء سے جماعت عسکری جدوجہد سے لاتعلق ہے۔ ایسے حالات میں، جب کہ جماعت اسلامی کشمیر، عسکریت میں براہِ راست یا بالواسطہ شریک بھی نہیں ہے اور تعلیمی، تبلیغی اور رفاہی کاموں میں مشغول ہے، اس پر پابندی لگانا سمجھ سے باہر ہے۔ ایسی کارروائی اور پکڑ دھکڑ سے کشمیر میں حالات مزید خراب ہونے کا احتمال ہے۔ بھارت نواز نیشنل کانفرنس اور پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی بھی اس پابندی کو غلط اقدام قرار دے رہی ہے۔

پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کی لیڈر اور جموں وکشمیر کی سابق وزیراعلیٰ محبوبہ مفتی نے سوال اٹھایا ہے: ''حکومتِ دہلی کو آخر جماعت اسلامی کشمیر سے اتنی پریشانی کیوں ہے؟ ہندو انتہا پسند گروپوں کو جھوٹ پھیلانے اور ماحول خراب کرنے کی پوری آزادی ہے، جب کہ ایک ایسی تنظیم پر پابندی لگائی جارہی ہے، جس نے کشمیریوں کی تعلیمی، سماجی اور فلاحی محاذوں پر لوگوں کی اَن تھک مدد کی ہے''۔ کوئی سیاسی نظریہ جب میدانِ عمل میں پوری طرح ناکام ہوجاتا ہے، تو اس کے حاملین زور زبردستی پر اُتر آتے ہیں۔ بی جے پی جب فکری سطح پر اشترا کی دانش وروں کا مقابلہ نہیں کرسکی تو اس نے 'شہری نکسل واد' کی اصطلاح گھڑ کر اپنے خلاف اُٹھنے والی آوازوں کو دبانے کی خاطر حقوق انسانی کا کام کرنے والوں کو 'باغی اور دہشت گردوں کے حامی' قرار دے دیا۔ ملک بھر میں 'شہری نکسل واد' کے نام پر جو کارروائی کی گئی، اب اسی کا اعادہ جموں وکشمیر میں جماعت اسلامی پر پابندی لگا کر کیا گیا ہے۔

نئی دہلی میں وزارتِ داخلہ کے ایک سینیر اہل کار سے جب میں نے جماعت پر پابندی کے پیچھے حقائق جاننے کی کوشش کی، تو انھوں نے فرمایا: ''جماعت اسلامی کشمیر سوسائٹی کو انتہا پسندی کی طرف لے جاکر ان کو 'سلفیت' کی طرف مائل کرکے مقامی خانقاہوں اور حنفیت سے متنفر کرواتی ہے''۔ جب میں نے کہا: ''اگر واقعی یہ بنیاد ہے تو خود اہل حدیث اور سلفی گروپوں پر پابندی کیوں نہیں لگائی گئی؟ اگر سلفی واقعی اتنے ہی خطرناک ہیں، تو جہاں تک مجھے یاد ہے کشمیر میں ۱۹۹۰ء میں صرف دو اہل حدیث مساجد تھیں، جو اب حکومتی اعداد وشمار کے مطابق ۴۰۰ سے تجاوز کرگئی ہیں۔

کون اس کی پشت پر ہے؟ اکتوبر ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر ذاکر نائیک کشمیر تشریف لائے تھے اور شہر کے وسط میں پولوگراؤنڈ میں، اننت ناگ کے اسٹیڈیم میں ان کی تقاریر ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ خود گورنر ہاؤس میں بھی ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد ہوئی تھی''۔ میں نے ان سے کہا کہ: ''شیخ نورالدین ولیؒ [۱۳۷۷ء-۱۴۴۰ء] المعروف 'نندہ رشی'[1] کے کشمیری زبان میں کلام کا اردو ترجمہ کرنے کا سہرا جماعت اسلامی کے رہنما قاری سیف الدین کے سر ہے۔ اسی طرح میر سید علی ہمدانیؒ [۱۳۱۴ء-۱۳۸۴ء] کا کشمیری مسلمانوں کو دیے گئے وظیفہ 'اوراد الفتیحہ' کا ترجمہ اور تفسیر بھی جماعت اسلامی کی مرہونِ منت ہے''۔ یہ سن کر مذکورہ افسر بغلیں جھانکنے لگا اور کہا کہ: ''کوئی پرانی فائل جماعت کے متعلق بنی ہوگی، جو ایسے مواقع پر نکالی جاتی ہوگی''۔ ایک عشرہ قبل حکومت کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ: ''کشمیر میں حریت اور تحریک آزادی کے خلاف فکری رہنمائی کے لیے سلفی حضرات کو استعمال کیا جائے''۔ اب کچھ عرصے سے یہ باور کرایا جارہا ہے کہ: ''صوفی ازم کا دامن تھام کر اس تحریک کو دبایا جائے''۔ تین سال قبل دہلی میں بھارتی وزیراعظم نریندرا مودی کی صدارت میں منعقدہ ایک صوفی کانفرنس میں ایک صاحب کو تو یہ بھی کہتے سنا، کہ: ''اب ہندو قوم پرستوں کی مربی تنظیم آر ایس ایس کے کارکنان اور مشائخ، مشترکہ طور پر وہابیوں اور دیوبندیوں کے خلاف شانہ بہ شانہ لڑیں گے''۔

۱۴ فروری کو پلوامہ واقعے میں مبینہ خودکش حملہ آور عادل احمد ڈار کا تعلق ایک بریلوی یا صوفی طرزِفکر رکھنے والے گھرانے سے تھا۔ پلوامہ کے گونڈی باغ گاؤں میں اس کے والد غلام حسن ڈار صاحب کے بقول: ''عادل ڈار، مقامی درگاہ میں نعت خوانی اور امام صاحب کی عدم موجودگی میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ قرآن کے چند پارے حفظ کرنے اور نعت خوانی کی مشق کے لیے اس نے چند ماہ ایک بریلوی دارالعلوم میں گزارے تھے اور حنفی اعتقاد سے اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ بحث ومباحثہ کرنے سے چُوکتا نہیں تھا''۔

یہ امر واقعہ، حکومتی پالیسی سازی کرنے والوں کے لیے ایک تازیانہ ہے، جو کشمیری تحریک کو

---

[1] ان کا ایک نعتیہ شعر ملاحظہ کیجیے:

کر یہ ما نتن چلہ درن کم درن نفس دو رندے

[ترجمہ: زاہد اور گوشہ نشین لوگ بھلا نفس امارہ کے حملوں کا کب مقابلہ کرسکتے ہیں؟]

مذہبی انتہاپسندی اور فرقہ پرستی سے جوڑتے ہیں۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں، کہ مغربی طاقتوں نے اپنے مفاد کے لیے پہلے طالبان، القاعدہ اور داعش جیسی تنظیموں کی پرورش کی۔ عراق میں تو داعش کو ہتھیار اور پھر ان کے خلاف لڑنے والی تنظیموں کو فوجی تربیت بھی دی۔ پھر یہ نعرے بلند کیے، کہ: ''مسلمانوں میں شدت پسندی آرہی ہے'' جسے لگام دینے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے تصوف کی تشہیر کی جانے لگی۔ یہ لوگ جان بوجھ کر اس حقیقت کو نظرانداز کرتے ہیں، کہ شدت پسند اور اعتدال پسند ہر فرقہ اور مسلک میں موجود ہوتے ہیں۔

بھارت میں تو ہمیشہ سے ہی حکومتیں مسلمانوں کو مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کی تقلید کی تاکید کرتی آئی ہیں، کیوں کہ ان دونوں رہنماؤں نے آل انڈیا مسلم لیگ اور نظریۂ پاکستان کے خلاف انڈین نیشنل کانگریس کو ایک متبادل نظریاتی اساس فراہم کی تھی، مگر کیا بھارت میں ان کے ارادت مندوں کو سکون مل سکا؟

یہ سچ ہے کہ دہشت گردی کی اسلام میں کوئی گنجایش نہیں ہے، نہ کوئی فرقہ یا مسلک ہی اس کی اجازت دیتا ہے۔ مظلوم علاقوں کے عوام اگر جبری قبضوں اور ظلم کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں، تو اس کو دہشت گردی کے ساتھ منسلک نہیں کیا جاسکتا۔ مغربی طاقتوں نے تصوف کی حوصلہ افزائی صرف اس وجہ سے کی، کہ اپنی سلگائی ہوئی آگ کے شعلے اس کے قابو میں نہیں آرہے تھے۔ ان کے یہاں 'تصوف کے نظریے' کا یہ پیغام ہونا چاہیے کہ مسلمان ہر حالت میں مہر بہ لب رہنے کی عادت بناڈالے۔ حالات سازگار ہوں تو شکر کے ساتھ خاموش رہے، اور اگر ظلم وستم اور عزت وآبرو کا خون ہوتا ہوا دیکھے، تب بھی خاموشی اور بے حسی کو شعار بناڈالے۔ بس ایسی صوفیانہ پروڈکشن کی مغرب کو ضرورت ہے، نہ کہ سید سالار مسعود غازی کی طرح ظلم کے خلاف آواز بلند کرے۔ تصوف کا مقصد انسانیت سے پیار، محبت، شفقت سے پیش آنا اور کردار سازی کرنا ہے، تاکہ نہ صرف گفتار، بلکہ اپنے کردار سے بھی ایک مسلمان دیگر مذاہب کے ساتھ مکالمہ کرے، جو صوفی بزرگوں کا خاصا رہا ہے، چاہے، کشمیر میں میر سیّد علی ہمدانی، نورالدین ولی ہوں یا بھارت میں خواجہ معین الدین چشتی یا نظام الدین اولیا ہوں!